اقبالیاتی ادب

علمی مجلّات کے مقالات کا تعارف

نبیلہ شیخ

محمد شفیع بلوچ، ''اقبال اور تصوف''، پیغام آشنا، اسلام آباد، اپریل- جون ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۰-۱۰۹۔

بعض حلقوں میں یہ اظہار خیال کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبال تصوف کے مخالف تھے۔ قیامِ یورپ سے واپسی کے بعد انھوں نے عجمی تصوف اور وحدت الوجود پر بڑی تنقید کی اور آخری عمر میں وہ پھر سے تصوف کی طرف مراجعت کرتے نظر آئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ مسخ شدہ تصوف اور صوفیائے خام کے خلاف تھے۔ وہ اس تصوف کے خلاف تھے جس کا خمیر عجمی خیالات و فلسفے کی آمیزش سے تیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسرار خودی میں اس غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس سلسلے میں جہاں اُن کی مخالفت ہوئی وہاں حمایت میں بھی دانشوروں نے قلم اُٹھایا۔ علامہ شروع ہی سے یونانی، رہبانی یا مسیحی، عجمی اور ہندی تصوف کے خلاف تھے۔ بعد میں انھوں نے حقیقی اسلامی تصوف کو تمام غیر اسلامی رسوم و قیود سے پاک کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

علامہ اقبال نے صوفیہ کی تصوف میں خدمات کا اعتراف کیا۔ وہ رومی جیسے وحدت الوجودی صوفی کو اپنا روحانی مرشد مانتے تھے۔ حلاج جیسا معتوب صوفی جاوید نامہ میں ایک عاشق صادق کی علامت قرار پایا۔ رومی کو اقبال ہر مفسر اور ہر فقیہ سے افضل سمجھتا ہے خود اس سے فیض اور دوسروں کو اس کی مریدی کی دعوت دیتا ہے۔ علامہ اگرچہ اصطلاحی معنوں میں صوفی یا ولی نہ تھے لیکن ان کے افکار میں صوفیانہ رجحان موجود تھا۔ اقبال نے ذکر و فکر، عشق اور ذوق و شوق، جذب و مستی اور حال و کیف جیسی صوفیانہ اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ خودی علامہ اقبال کے فلسفے کی بنیاد ہے، جو اصل میں عشق کا پرتو ہے اور یہی عشق صوفیہ اور اقبال کی مشترکہ میراث ہے۔ جاوید نامہ سے لے کر ارمغان حجاز تک علامہ نے فقر کی توصیف میں جس قدر لکھا اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقر غایت انسانی ہے۔ اقبال کہتے ہیں اسلام کو دین فطرت کے طور پر محسوس اور اختیار کرنے کا نام تصوف ہے، اور ایک اخلاص مند مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلام کی اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرے۔

☆☆☆

ڈاکٹر این ماری شمل، ''ابلیس: اقبال کی شاعری میں''، احیائے علوم، لاہور، جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۳۲-۳۳۔

اقبال کے کرداروں میں سب سے دلچسپ کردار شیطان یا ابلیس کا ہے۔ شیطان اسلامی روایت میں ہمیشہ ہی سے ایک اہم کردار رہا ہے۔ شیطان کے بارے میں مختلف مسیحی و اسلامی رویوں کا تانا بانا کلامِ اقبال میں انتہائی خوبصورتی سے بنا گیا۔ شیطان کے کردار سے دلچسپی اُن کے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے میں بھی نظر آتی ہے لیکن اس کا اہم ترین مظہر جاوید نامہ ہے۔ شیطان سے متعلق اقبال کے یہ تصورات حلاج اور اس کے مشہور شارح روزبہان بقلی (متوفی ۱۲۰۹ء) سے مستنبط ہیں جن کے ہاں شیطان ایک ایسے عاشق کے روپ میں نظر آتا ہے جو فعال اور متحرک رہنے کے لیے ہجر و فراق کو وصال پر ترجیح دیتا ہے۔ کلامِ اقبال میں شیطان محض عقل پرست یا مادہ پرست یا تقدیر پرست یا آدم دشمن نہیں ہے۔ شیطان ایک ایسی طاقت ہے جس کے خلاف مزاحمت انسان کے ارتقا کے لیے ناگزیر ہے۔ ہر اعتبار سے شیطان انسان کا ایک ناگزیر رفیق ہے۔ جسے انسان زیر کر کے انسان کامل کے مقامِ عالی پر فائز ہوسکتا ہے اور انسان کامل کا نمونہ ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

☆☆☆

ڈاکٹر عظمیٰ سلیم، ''فکر اقبال، نصابِ تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں''، اخبار اُردو، اسلام آباد، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۸-۱۰۔

آج کے پاکستان کے شہری علامہ اقبال کو قومی شاعر کی حیثیت سے جانتے ضرور ہیں مگر پہچانتے نہیں۔ آج سے ایک نسل قبل اسکول کھلنے کے ساتھ ہی ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' گاتے ہوئے بچے کم از کم اپنے دن کی ابتدا علامہ اقبال کی نظم کے ساتھ کرتے۔ یہ رجحان وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتے ہوئے اب اس حد تک آ پہنچا کہ قومی ترانے کے الفاظ بھی غائب ہوگئے۔ اور طلبہ محض دھن کی حد تک قومی ترانے سے واقف ہیں۔ دعا سے قطع نظر اقبال کے اشعار سے واقفیت نئی نسل میں افسوسناک حد تک کم ہے۔ نصابِ تعلیم کے جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ صوبائی سطح پر نصابِ تعلیم یکساں نہیں، جس کے لیے ضروری ہے اقبال کے فکر و فن کو طلبا کی ذہنی سطح کے مطابق نصاب میں تقسیم کیا جائے۔ اقبال کو نئی نسل میں بحیثیت قومی شاعر متعارف کرانے کے لیے کسی ایک متفقہ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ انفرادی حیثیات میں کی گئی کوششیں اس قدر مؤثر نہیں ہوسکتیں۔ بحیثیتِ قوم ہماری سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ قوم کا ہر بچہ نہ صرف حیاتِ اقبال بلکہ فن و فکر اقبال سے پوری طرح آگاہ ہو۔ تاکہ جس مسلمان قوم کو اقبال خوابِ غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے اس کی نوجوان نسل آج بھی اسی پیغام سے تازہ دم اور چوکنا اور

اپنے اسلاف کے کارناموں سے باخبر اور ان کی اصل امین ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر تحسین فراقی، ''اقبال کے شعر و فلسفہ پر رومی کے اثرات''، مخزن، لاہور، شمارہ ۱۵، ص ۷۸-۸۸۔

اقلیم شعر و فکر میں روشن نگری و رجائیت کے دو نہایت پر جوش اور انقلاب آفریں علم بردار رومی اور اقبال کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال کے شعری اور نثری سرمایے کو کلیتہً نگاہ میں رکھا جائے تو ان کے یہاں متعدد فارسی شعرا و ادبا اور مشرقی و مغربی فلاسفہ و ادبا سے ربطِ فکری کے شواہد ملتے ہیں۔ اقبال کے اُردو اور فارسی کلام میں رومی کا نہایت تسلسل سے ذکر ملتا ہے۔ ان کی پہلی شعری تصنیف اسرار خودی سے آخری شعری مجموعہ ارمغان حجاز تک میں رومی کا تواتر سے تذکرہ کیا گیا ہے۔

اقبال اور رومی کے یہاں محض اسلوب شعری ہی میں نہیں، موضوعات شعری میں بھی کمال مشابہت نظر آتی ہے۔ دونوں کے تصورِ انسان، تصورِ حیات اور تصورِ عشق نیز ان تصورات کے تحت ذیلی تصورات میں حیرت انگیز مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں بے مثال مفکر شاعر کہے جا سکتے ہیں۔ فکر رومی سے اقبال کی تاثیر پذیری کا ایک ثبوت رومی کے متعدد اشعار کی تضمینات اور رومی کی زمینوں میں کہی گئی غزلیں ہیں۔ نہ صرف شاعری میں بلکہ اقبال نے اپنے اہم ترین نثری کارنامے تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں بھی کئی جگہ رومی کا ذکر کمال شیفتگی سے کیا ہے۔ یورپ اور خصوصاً امریکہ میں رومی کی روز افزوں اور حیرت انگیز مقبولیت کا سبب یہی ہے کہ روحانی طور پر بنجر اور باطنی سطح پر کھوکھلی تہذیب کے فرزندوں کو رومی کی صورت میں ایک ایسا نجات دہندہ مل گیا، جو اُن کے اندر کی تشنگی کو بجھانے کا سروسامان کر سکتا ہے۔ اور ان کے باطن میں آتش کی چنگاری روشن کر سکتا ہے کہ یہی کام روشن ضمیر لوگ تہذیبوں کے بجھتے چراغوں کو سہارا دینے کے لیے ہر دور میں کرتے رہے ہیں۔

☆☆☆

عظمیٰ عزیز خان، ''مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق- تعارف و اہمیت''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۱-۲۷۔

مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کا شمار بجا طور پر اقبال کی اہم ترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔ یہ وہ مثنوی ہے جس میں اقبال کی فکریات کا اختصار اور جامعیت کے ساتھ بھرپور اظہار اور ابلاغ ہوا ہے۔ اس مثنوی کا سبب تالیف اقبال کا وہ خواب ہے جو انھوں نے ۱۳/اپریل ۱۹۳۶ء کو بھوپال میں دیکھا جہاں وہ علاج کی غرض سے گئے تھے۔ اس خواب میں ان کی ملاقات سرسید احمد خاں سے ہوئی جنھوں نے

اقبال سے کہا کہ وہ بارگاہِ رسالت میں اپنی بیماری کا ماجرا پیش کر کے استغاثہ کریں۔ اقبال خواب سے بیدار ہوئے تو یہ شعر ان کی زبان پر جاری تھا:

با پرستاران شب دارم ستیز باز روغن در چراغ من بریز

اقبال نے اپنے اس خواب اور مثنوی کا ذکر سر راس مسعود کے نام خط میں بھی کیا۔ مثنوی پس چہ باید کرد کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اقبال کا روئے سخن محض کسی فرد یا ایک قوم کی طرف نہیں بلکہ ان کا خطاب پورے عالم مشرق سے ہے۔ ایسے حساس موضوع کے ابلاغ کے لیے اقبال جیسے صاحب بصیرت مصلح نے بڑا حکیمانہ انداز اپنایا۔ اقبال نے اس مثنوی میں مشرق کو حرکت و عمل اور مبارزت کا درس دیا۔ مشرقی اقوام کو مغرب کے حیلہ و فریب سے خبردار کیا اور استعماری سیاست کا اعلیٰ انسانی اور اسلامی حکومت سے تقابل کیا ہے۔ اس مثنوی میں اقبال نے اقوام مشرق کو حقیقی فقر و درویشی کا راستہ دکھایا۔ یہی مصطفائی فقر انھیں پستی اور زبونی سے نجات دلا سکتا ہے۔

اقبال کو تصوف اور روحانیت سے جو لگاؤ تھا اس کا اظہار ان کی ہر تحریر سے ہوتا ہے۔ پس چہ باید کرد میں بھی عرفان و روحانیت کی ذوق افروز لہریں موجزن ہیں۔ اس طرح وہ اپنی اسلامی ذہنی ساخت کی بنا پر کلام کو آیات و احادیث، اقوال اور ضرب الامثال سے بھی مزین کرتے ہیں اور یہ سارا عمل کامل طور پر فنکارانہ بے ساختگی سے رُو پذیر ہوتا ہے۔

☆☆☆

سیّد اظفر رضوی، ''اقبال کا تصورِ اسلام''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۷-۴۵۔

علامہ اقبال کے تصورِ اسلام سے عقل و فکر کے تحریکی جذبے اُجاگر ہوتے ہیں جس سے شاعری کی ہستی کا شعلہ دراصل اس کے فن کو بقائے دوام بخش دیتا ہے۔ شعر و ادب کے بقائے دوم میں کسی بھی فنکار یا تخلیق کار کا شعلہ خُو ہونا، شعلہ رُو ہونا، شعلہ فشاں ہونا یقیناً اس کی ہستی کے اضطراب، بے چینی اور بے قراری کا مظہر ہوتا ہے۔ علامہ کی شعری اور نثری تحریریں ان کی علمی کاوشوں کا نچوڑ ہیں۔ وہ خودداری، مساوات، انکسار، وسعتِ نظر، رجائیت اور ضبطِ نفس کا درس دیتے ہیں۔

اقبال کا ''تصورِ اسلام'' جدید دور کے لیے ایسا دلکش پیغام ہے جس سے ہر عام و خاص رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اقبال کے تصورِ اسلام کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے کلام کی نورانی کیفیت اور ان کی تقاریر و مضامین کی دانش برہانی کو اپنے فکر و خیال میں جگہ دینا ہوگی تاکہ ہم نوعِ انسانی کی بقا کی جنگ میں کامرانی حاصل کر سکیں۔ اقبال ہمیں انسانیت، محبت، یگانگت، عدم تشدد، بھائی چارہ اور پُرامن زندگی گزارنے کی راہ دکھاتے ہیں۔ اور اگر ہم اقبال کے تصور اسلام سے فیض یاب نہیں ہوں گے تو اس کا انجام بھی مزید

پریشانیوں اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

☆☆☆

رابعہ سرفراز، ''اقبال کے اجتہادی تصورات''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۶-۲۰۔

اقبال ایسے دور میں پیدا ہوئے جو مسلمانوں کے انحطاط اور پستی کا دور تھا۔ مایوسی اور بے یقینی کی کیفیات میں گھرے ہوئے مسلمان اسلام کی زندگی بخش تعلیمات سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اقوامِ مغرب کی مادی ترقی نے اہل اسلام کو مادیت پرستی کی طرف راغب کر دیا تھا۔

اقبال کے فکری اور ذہنی ارتقا میں ان کے اجتہادی تصورات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کے اہم مسائل کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کو دیانت داری، صداقت، مکمل خلوص اور ذہانت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا۔ ابتدا میں اقبال نے اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر اجتہاد کے مقابلے میں تقلید کو ترجیح دی تھی جو اس دور کی مصلحت آمیز حکمت عملی تھی۔ لیکن بعد میں اپنا نقطہ نظر تبدیل کیا اور فرمایا کہ اگرچہ قومی شیرازہ بندی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن کسی بھی قوم کی زندگی کا دارومدار مادیت یا مصنوعی شیرازہ پر نہیں ہوتا بلکہ اس سلسلے میں افراد کی ذہنی اور جسمانی نشوونما بہت اہم ہے۔

اقبال اجتہاد کی اہمیت پر زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو اجتہاد کی طرف توجہ دینی چاہیے ورنہ قرآن کی تعلیمات ہمارے زمانے کے لیے بے کار ثابت ہوں گی۔ اقبال کی رائے میں جو شخص قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس یعنی اُصولِ فقہ پر تنقیدی نگاہ ڈال کر قرآنی احکام کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا، بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم ہوگا۔ موجودہ حالات میں اگر اجتہاد کا کام افراد کی بجائے مجالس کے سپرد کر دیا جائے تو یقیناً ہمارے قانون کے ارتقا کا باعث ہوگا۔ کسی قانون کے کتاب وسنت کے موافق یا مخالف ہونے کے فیصلے کے بارے میں اقبال کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں جب مسلمان ممبران مجالس اسلامی قوانین سے مکمل طور پر واقف نہیں ہیں، اس اہم سوال کا جواب ان ممبران پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کا صحیح حل یہی ہے کہ موجودہ قانونی تعلیم کی اصلاح کی جائے اور اسے زمانۂ حال کی روح سے تطبیق دی جائے۔ لیکن ابتداً یہی ہے کہ اس قسم کے تمام فیصلے عدالت عالیہ کے سپرد کر دیے جائیں۔ اسلامی فقہ کی حرکت پذیری، اسلام کی آفاقی تعلیمات اور اسلامی آئین کے چار اہم اور بنیادی ماخذوں کے ذکر اور مذہب اور فلسفے کے تقابلی جائزہ میں مذہب کو فلسفہ پر ترجیح دیتے ہوئے اقبال نے اپنے اجتہادی تصورات پر مکمل روشنی ڈالی ہے اور مدلل انداز میں اسلام کی تشکیل جدید کا تصور پیش کیا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، ''اقبال کی تلمیحی علامات''، قومی زبان، کراچی، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۵۔

علاماتِ اقبال کا ایک اختصاصی پہلو تاریخی تلمیحوں کو علامتی رنگ و آہنگ سے ہم کنار کر کے انھیں حسن و معنویت عطا کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اپنے مطمحِ نظر کی ترسیل کرتے ہوئے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں اور جو تاریخی کردار یا واقعہ انھیں اس ضمن میں قریب تر محسوس ہوتا ہے اسے کمال درجے کی مہارت سے علامتی پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ خصوصاً قرآنی تلمیحوں کی علامتی حیثیت قابلِ تحسین ہے۔ کلامِ اقبال میں تلمیحی علامتیں عہدِ حاضر کے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو مہمیز کرتی نظر آتی ہیں۔

قرآنی تلمیحات پر مبنی علامتوں ہی کے ذیل میں ابلیس کی علامتی معنویت کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ کلامِ اقبال میں یہ تلمیح زیادہ تر شعری کردار کی حیثیت رکھتی ہے تاہم اس کے رمزی ابعاد بھی لائقِ اعتنا ہیں۔ شعرِ اقبال میں تلمیحی علائم و رموز میں بعض مقامات پر دنیائے علم و فلسفہ کی مؤقر شخصیات کو بطور علامت پیش کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ خاص طور پر ایسی علمی و فلسفیانہ شخصیات کو وجدان اور عشق کے نمایندہ اشخاص مثلاً حضرت بلالؓ، جنید بغدادی، عطار اور رومی وغیرہ کے ساتھ لا کر بڑے مؤثر طور پر نمایاں کیا گیا۔ اقبال فارابی، بوعلی سینا، رازی اور غزالی جیسے مسلم فلاسفہ کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

فنی و ادبی تاریخ کی تلمیحوں میں بہزاد، خضر، آبِ حیات، لیلیٰ مجنوں اور سعدیٰ بلخی خاص طور پر نئی معنوی تعبیرات لیے ہوئے ہیں۔ شعرِ اقبال میں تلمیحی علامات کے یہ متنوع اَبعاد اس حقیقت سے باخبر کراتے ہیں کہ علامہ کے علامتی نظام میں تلمیحیں خواہ قرآنی ہوں یا اسلامی و غیر اسلامی، علمی و فلسفیانہ ہوں یا فنی و ادبی تمام صورتوں میں ترسیلِ مطلب مقدم ہے۔ علامہ کے تلمیحی علائم و رموز اس لحاظ سے بھی لائقِ ستایش ہیں کہ آفاقی خصائص کے حامل ہونے کے سبب ان کا اطلاق بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی اور مذہبی منظرنامے پر بآسانی کیا جاسکتا ہے، جو یقیناً نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

☆☆☆

ظفر حجازی، ''فکرِ اقبال کا ماخذ، قرآن مجید''، افکار معلم، دسمبر، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷-۲۹۔

قرآن مجید نے بنی نوع انسان کو علم کا وہ راستہ دکھایا جس پر چل کر مسلمانوں نے علوم و فنون میں حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے۔ یہ علمی سرگرمیاں، تحقیق و تفتیش کی لگن اور علوم و فنون کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ذوق قرآن مجید کی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔ قرآن مجید نے جہاں مسلمانوں کو مظاہرِ فطرت پر غور و خوض کی تعلیم دی وہاں اقوام و ملل کے عروج و زوال اور اجتماعی حیات و ممات کی حقیقتوں تک پہنچایا۔ قرآن مجید کا علم و فکر سے کام لینے کا مطالبہ ہر انسان سے ہے اور ہر چند خاص لوگوں ہی کا کام نہیں بلکہ یہ ایک رویہ

ہے زندگی بسر کرنے کا جس کا اسلام ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک بنی نوع انسان کی پوری تاریخ قرآنی حقائق و معارف کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ قرآن سے زیادہ کسی اور ارضی و سماوی کتاب نے انسان کو اس بلند مقام پر نہیں پہنچایا جس کی قرآن نے اطلاع دی۔ انسانی خودی کا حقیقی عرفان قرآن سے پہلے ہمیں نظر نہیں آتا۔ اقبال کے نزدیک ایک مسلمان کے لیے قرآنی تعلیمات پر عمل کیے بغیر مسلمان رہنا ممکن نہیں۔ اس کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، مسلمانوں کے لیے قرآن کو نظر انداز کرنا تقاضائے ایمان کے منافی ہے۔ مسلمانوں کا سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی، تجارتی اور عدالتی نظام قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔ قرآن کی تعلیمات ہی مسلمانوں کو اجتہاد کی اجازت دیتی ہیں۔ قرآن مجید ایک زندہ کتاب ہے اس کی تعلیمات قدیم اور لازوال ہیں جن لوگوں نے قرآن مجید کی تعلیمات کو قبول کیا اور اسے اپنی زندگی کا مرکز و محور بنایا وہ دنیا میں سرفراز ہوئے۔ اقبال اپنے عمر بھر کے غور و فکر اور علومِ اسلامیہ پر تدبر و تفکر کا حاصل، قرآن مجید سے متعلق تشریح و تفسیر کی صورت میں قلم بند کرنا چاہتے تھے، انھوں نے زندگی بھر قرآن، علومِ دینیہ اور مسلمانوں کے فکری اثاثے پر غور و فکر کیا۔ ان کا اُردو اور فارسی کلام اور تقاریر و خطبات (انگریزی) اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ان کے فکری منابع میں قرآن مجید کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

☆☆☆

عبدالحی، ''اقبال کا تصورِ تعلیم: چند اساسی نکات''، کتاب نما، نئی دہلی، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۹-۴۶۔

بنیادی طور پر اقبال کے نزدیک علم کا مقصد فرد کی ذہنی اور فکری تربیت ہے۔ وہ علم جو فرد میں احترامِ آدمیت اور مقامِ آدمیت کا شعور بیدار کرے اور وہ اِنی جاعل کے مصداق ہو سکے معاشرے کے لیے رحمت بن جائے۔ ہمیں نہ صرف ظاہری اشیا کا علم حاصل کرنا چاہیے بلکہ اپنے وجود اور اپنی خودی کا عرفان حاصل کرنا بھی اشد ضروری ہے، کیونکہ خودی کے عرفان کے بغیر آفاق کا مطالعہ نامکمل رہے گا۔ ایسا قطعی نہیں کہ اقبال صرف روحانی تربیت کے حامی ہیں اور حصول معاش یا دنیوی زندگی کے منکر ہیں بلکہ اقبال روحانی اور مادی زندگی میں مطابقت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جدید علوم اور صنعتی ترقی کی حمایت کرتے ہیں۔ اقبال ایسے نظامِ تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں جس میں عورت کے منصب امومت کا احترام نہیں۔ مرگ امومت کو اقبال حضرتِ انسان کی موت قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے ذہن میں ایک ایسی یونی ورسٹی کا خاکہ موجود تھا جہاں لڑکیوں کو ان کے فطری تقاضوں کے مطابق تعلیم دی جائے۔

اقبال نے علم و تعلیم کے میدان میں عملی اقدام بھی اُٹھائے۔ اورینٹل کالج، گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ

کالج میں تدریس بھی کی۔ لندن یونی ورسٹی میں چھے ماہ تک عربی کا درس بھی دیا۔ میٹرک سطح کی کچھ درسی کتابوں کی تدوین بھی کی۔ اور ایک یونی ورسٹی کے قیام کا ارادہ بھی اقبال کے ذہن میں تھا، لیکن زندگی اور وسائل کی بے وفائی کے باعث ان کا یہ منصوبہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ جو لوگ بھی اقبال سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں ان کے افکار و نظریات کے معتقد ہیں انھیں چاہیے کہ اقبال کے اس منصوبے کا احترام کریں اور اس کے مطابق ایک ادارہ قائم کرنے کی سعی کریں۔ اقبال کے لیے اس سے زیادہ مخلص اور بامقصد خراج عقیدت اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆

حامد کاشمیری، ''اقبال کا ایک گم نام نقاد: احمد دین''، کتاب نما، نئی دہلی، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۵-۱۰۔

علامہ اقبال کی وفات کے بعد ان کی حیات، شخصیت، عقائد و نظریات اور کلام پر سیکڑوں تنقیدی کتابیں اور مقالے لکھے گئے۔ ایک ضخیم اور وقیع تنقیدی کتاب بعنوان اقبال ان کے ایک معاصر نقاد مولوی احمد دین نے ان کے جیتے جی شائع کی۔ احمد دین کے علامہ اقبال سے تعلق خاطر کے چند در چند اسباب تھے جن کا ذکر مشفق خواجہ اور دیگر محققین مثلاً عبداللہ قریشی، حکیم احمد شجاع اور احمد دین کے بیٹے خواجہ اعجاز نے کیا۔ اقبال اور احمد دین کشمیری الاصل تھے۔ دونوں انجمن کشمیری مسلمانان کے سرگرم رکن تھے۔ دونوں وکالت سے وابستہ تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال بعض قانونی معاملات میں احمد دین سے مشورہ کرتے تھے۔ احمد دین کی متعدد تصانیف اور ادبی مشاغل ان کے ایک پختہ کار ادیب ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ نیز اقبال سے وابستگی اور ان کی شاعری اور عقائد کے لیے جذبہ احترام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کلامِ اقبال سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے اقبال کے کلام جو وہ نجی صحبتوں میں علامہ سے سنتے تھے یا ادبی محفلوں اور مشاعروں میں سنتے تھے یا جو مختلف رسائل میں شائع ہوتا تھا، کو مرتب کر کے اور اس پر ایک گہری تنقیدی نظر ڈال کر ۱۹۲۳ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال اپنے پہلے مجموعہ کلام کی طباعت پر غور کر رہے تھے اسی دوران احمد دین کی کتاب ان کی نظر سے گزری۔ انھوں نے احمد دین کی توقعات کے خلاف کتاب کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور وجہ یہ بتائی کہ احمد دین نے لگ بھگ وہ سارا کلام جمع کر دیا ہے جو وہ خود بانگ درا کے لیے منتخب کر رہے تھے۔ اقبال نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ احمد دین کی کتاب بانگ درا کو متاثر کر سکتی ہے۔ احمد دین نے اقبال کے اس فوری ردعمل سے واقف ہوتے ہی فی الفور اپنی کتاب کی ساری جلدیں اپنے صحن میں نذرِ آتش کر دیں۔ یہ واقعہ احمد دین کے دل میں اقبال کی قدردانی اور عقیدت کا غماز ہے۔ اتفاق سے اس کتاب کی ایک دو

جلدیں آگ میں ضائع ہونے سے بچ نکلی تھیں۔ ۱۹۲۶ء میں احمد دین نے علامہ کی تحریک پر ۱۹۲۳ کی مطبوعہ کتاب میں ترمیم وتبدیلی اور حک و اضافہ کے ساتھ طبع کرایا اور تنقیدی نظر سے اقبال شناسی میں اولیت کا درجہ حاصل کیا۔ احمد دین کی کتاب کی اہمیت اس لیے بھی دوچند ہوتی ہے کیونکہ اقبال کی وفات کے بعد بیشتر نقادوں نے اپنے اپنے پیرایہ بیان میں انھی سوانحی حالات اور شعری محاسن کا ذکر کیا ہے جو احمد دین نے نشان زد کیے ہیں۔ احمد دین نے اقبال کے کلام کا جائزہ ان کے سماجی اور تاریخی پس منظر میں لیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح عبدالحق نے بعض شعرا مثلاً میر تقی میر کا جائزہ لیا ہے۔ ظاہر ہے احمد دین نے مسلمہ تنقیدی عمل سے کام لیا ہے، اس لیے یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اقبال شناسی کے تاریخی سفر میں احمد دین کی کتاب کو ایک اہم اور بلند درجہ حاصل ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، ''شاہین.....اقبال کی ایک کلیدی علامت''، اُردو نامہ، لاہور، ص ۱۱۳-۱۲۱۔

شاہین اقبال کی محبوب علامت ہے جسے وہ باز، عقاب اور شہباز کے ناموں سے بھی ظاہر کرتے ہیں۔ شعرا اقبال میں یہ رمز انسان کامل کے لیے موزوں ہوئی ہے اور علامہ نے اس پرندے کے اوصافِ عالیہ کی وساطت سے اپنے اس مرکزی تصور کی توضیح وتصریح کا فریضہ احسن طور پر انجام دیا ہے۔

شاہین کی علامت کے ضمن میں اقبال کے ہاں مختلف اَبعاد ملتے ہیں۔ اولاً تو یہاں اس بے مثل پرندے کے ان اوصاف سے آگاہی ہوتی ہے جو اس کا امتیازِ خاص ہیں۔ ثانیاً اقبال اسے افرادِ ملت خصوصاً نژادِ نو کی نمایندگی کے لیے برتتے ہیں اور ثالثاً کرگس یا گدھ جیسے طاقتور اور قمری کبک اور کبوتر وغیرہ کی قبیل کے کمزور پرندوں کے ساتھ اس کا تذکرہ کر کے تضاد وتقابل کی فضا تشکیل دیتے ہیں۔ جس سے ان کا مقصد شاہین کی رمزی معنویت اُجاگر کرنا ہے۔ شاہین کی رمزی شان ان کے کلام میں عقابی روح کی تشکیل پر منتج ہوئی ہے۔ اقبال نے شاہین کی علامتی معنویت اُجاگر کرنے کے لیے مذکور کمتر درجے کے پرندوں کی متعین خصوصیات سے حیرت انگیز کام لیا ہے۔ وہ بلبل اور شاہین کا تقابل کر کے اس میں شاہین کی اَدا دیکھنا چاہتے ہیں اور کنجشک یا عصفور کو کمتری کے علائم قرار دے کر عقاب کی ان پر برتری ثابت کرتے ہیں۔ ان کے مطابق تیتر یا دراج اس لیے لائق مذمت ہے کہ وہ شاہین کے برعکس فطرت کے اشارات سمجھنے سے قاصر ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ مرگِ مفاجات سے دوچار ہوتا ہے۔ دراصل اقبال سمجھتے ہیں کہ اگر نفس ''سینہ دراج'' پُرسوز ہوتو معرکہ باز ہرگز مشکل نہیں ہے۔ اقبال کی شاہین کی علامت ایک آفاقی تقویت کی علامت ہے۔ شاہین سامراج کے خلاف جدوجہد کی علامت ہے جو تیسری دنیا کے اقوام میں یقین محکم اور

آزادی و حریت کے عمل پیہم کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ نئے عالمی تناظر میں شاہین کی علامت تیسری دنیا کی حریت پسندی کی علامت ہے۔ اس لیے شاہین کی علامت میں ان کو وہ خودداری، قلندری اور غیرت مندی نظر آئی جو انسان کی ہمت مردانہ کو اس بلندی پر پہنچا سکتی ہے، جو ستاروں سے آگے والے جہان سے تارے بھی توڑ کر لانا ممکن بنا سکتا ہو۔ یہ علامت اقبال کی شاعری کا مزاج بن گئی اور اسے کردار کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

☆☆☆

ظفر حجازی، ''عصر حاضر کا علم اور تہذیب و ثقافت اقبال کی نظر میں''، افکار معلم، لاہور، نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۵-۳۲۔

علامہ اقبال نے اگرچہ علم کو قدیم و جدید کے خانوں میں تقسیم کرنے کو غلط قرار دیا ہے تاہم انھوں نے جدید علوم و فنون کی تباہ کاریوں اور اس کے انسانی ترقی پر مہلک اثرات کا بہ بانگ دہل اظہار کیا۔ مغربی تہذیب و ثقافت اور مغربی افکار کی عملی صورت سے بنی نوع انسان کو پہنچنے والے نقصان کا بغور مشاہدہ کیا۔ مغربی علوم نے انسان کو جس ذہنیت کا مالک بنایا ہے اس کے مظاہر مغربی قوموں کی فتوحات اور نوآبادیاتی نظام کے تحت ان پسماندہ ممالک کی سیاسی، معاشی، تہذیبی حالت میں دیکھے جا سکتے ہیں کہ یہ بے دین نظامِ فکر دنیا کے جس خطے میں بھی پہنچا وہاں دین و اخلاقیات کی اعلیٰ اقدار ختم ہوگئیں۔ مغرب نے عقل و دانش کی بنیاد پر حقیقت تک رسائی کی کوشش میں خود ساختہ نظریات و افکار کی بنیاد پر جو علوم پیدا کیے اور ان علوم نے جو ذہنیت پیدا کی اس نے انسانیت کو اصل جوہر سے محروم کر دیا ہے۔ آج دنیا بھر میں سیاست، معیشت، تعلیم، عدالتی، تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی اقدار میں اسی لادینیت کا زہر کارفرما نظر آتا ہے۔

قیامِ یورپ کے دوران ہی میں اقبال کو علم حاضر کی تباہ کاریوں سے واسطہ پڑا۔ مغربی فکر اور مغربی علوم کی لادینیت پر علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں جابجا تنقید کی ہے۔ اب یہ مسلمان اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ اس کے لیے وحی کے یقین افروز علم کی ضرورت ہے۔ اقبال اسی علم کی روشنی کو دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں۔ مغرب اپنے قائدانہ کردار میں ناکام ہوگیا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کو سکون و اطمینان اور اس کے مسائل کا حل نہیں دے سکا۔ اب یہ کام ملت اسلامیہ کا ہے۔ اقبال ملت اسلامیہ کو ان اوصاف کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں جو دنیا کی امامت کے لیے ضروری ہے۔

☆☆☆

خیال آفاقی، ''کلامِ اقبال کی شعری لفظیات-تشبیہ و استعارہ کا جہان معانی''، الاقربا، اسلام آباد، اکتوبر تا

دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۹۲-۱۰۰۔

اقبال نے اُردو میں جس قدر شاعری کی ہے وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے متنوع ہے اور اپنی ڈکشن کے لحاظ سے بھی منفرد ہے۔ اقبال کی شاعری میں استعمال ہونے والی تراکیب اقبال کی اپنی اختراع ہیں۔ یہی دعویٰ ان استعاروں کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے جو اقبالیات کی شناخت اور کلامِ اقبال کی روح ہیں۔ جلوہ، کلیم، طور سینا، تجلی اور چشم بینا یہ سارے الفاظ علامت ہیں اس بات کی کہ اقبال کے لاشعور میں شاعری کے حوالے سے مستقبل کا نقشہ ہی اور تھا جیسا کہ بعد میں انھوں نے بحیثیت شاعر اسلام پوری دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اقبال خارج سے بھی زیادہ باطن کے مصور ہیں۔ وہ اپنے اندرونی ماحول اور فضا کی تصویریں بنانے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ تمام نظمیں خوبصورت تراکیب اور حسین استعاروں سے مزین ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے شاعر کے اندر حسن اور ذوقِ جمالیات کے چشمے زمزمہ خوانی کررہے ہیں۔

اقبال نے ملت اسلامیہ کو جو کچھ دیا وہ عشق رسولؐ کی عطا تھی اور یہ فیضان رسول عربیؐ ہی تو ہے کہ اقبال نے اپنی فکرحجازی کے ذریعے جہاں دلِ مسلم کو ایک ولولۂ تازہ بخشا وہیں عشق رسولؐ کو ایک نئے اُسلوب اور نئے عنوان کے ساتھ امت میں متعارف کرایا۔ وہ نیا عنوان کیا ہے؟ ''وفائے محمدؐ''، جس کو اقبال نے رب اکبر کی طرف سے اعلان کی صورت بیان کیا ہے۔

☆☆☆

نغمہ زیدی، ''اقبال کا فلسفۂ بےخودی''، الاقربا، اسلام آباد، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۷-۹۔

علامہ محمد اقبال نے جہاں اپنے عالمگیر فلسفۂ خودی کو موضوعِ کلام بنایا وہاں اس فلسفے کی تکمیل رموز بےخودی لکھ کر کی کیونکہ صرف انفرادیت ہی انسانیت کا منتہائے کمال اور آخری نصب العین نہیں بلکہ تشکیل انفرادیت دراصل تمہید ہے تعمیر اجتماعیت کی۔ اسرار و رموز میں انفرادیت کو خودی سے اور اجتماعیت کو بےخودی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں مثنویاں ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ اسرار خودی میں جہاں افراد کے لیے خودی اور خودداری ذریعۂ استواری ہے، وہیں افراد کا اپنی ہستی، اور اپنی انفرادی زندگی کے جزو کو قومی زندگی کے کل میں شامل کردینا قومی ترقی کے لیے لازم ہے اور اسی کو بےخودی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اقبال کا نصب العین یہ تھا کہ افراد اور قوم کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کرکے ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید کی جائے۔ اور انسانیت کی تکمیل کا معیار کسی خاص ملت کو بنایا جائے۔ رموز بےخودی میں اقبال نے ''ارکان اساسی ملیۂ اسلامیہ'' کے عنوان کے تحت توحید، رسالت اور اخوت جیسے

موضوعات کی تشریح کی ہے۔ کلمہ توحید ہی ملت بیضا کے تن کی جان ہے۔ رسالت کی بدولت لاتعداد انسان ہم نوا اور ہم مدعا ہوجاتے ہیں۔ اسلامی اخوت کی بنا پر قوموں کو عروج حاصل ہے۔ چنانچہ رموز بے خودی میں ''در معنی این کہ مقصود رسالت محمدیہؐ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات بنی نوع آدم است'' کے عنوان کے تحت اقبال نے تمام نوع انسانی کے لیے آزادی اور برابری کا پیغام دیا ہے۔

☆☆☆

محمد منیر، ''علامہ اقبال، اکیسویں صدی کا شاعر فلاسفر''، اخبار اُردو، اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲-۱۰۔

علامہ اقبال سے پہلے اردو شاعری میں شاعر فلاسفر کا ذکر نہیں ملتا۔ اگرچہ فلسفہ کا علم نہایت اہمیت کا حامل ہے مگر لوگ عام طور پر اس کا ادراک نہیں رکھتے۔ فلسفی لوگوں کو معاشرے سے الگ تھلگ کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے فلسفہ پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس مروجہ سوچ کی وضاحت کی جائے کہ علامہ اقبال کے اکثر خیالات مغربی فلاسفر خاص طور پر ہنری برگساں اور فریڈرک نیٹشے سے ماخوذ ہیں۔ اقبال کا اندازِ فکر نیٹشے سے ماخوذ نہیں، چند ابتدائی مماثلتوں سے قطع نظر اقبال کا فلسفہ نیٹشے سے بہت آگے ہے۔ اقبال کا فلسفہ رہنمائی کا فلسفہ ہے جو آج بھی اپنی تب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ جبکہ نیٹشے کے تصورات آج کے دور میں خاصے مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ انھی خیالات کی بنیاد پر علامہ اقبال نے نیٹشے کو مجذوب فرنگی کہا ہے۔ برگساں کے فلسفے میں چار چیزیں بہت اہم ہیں: ۱-تخلیقی ارتقا ۲-جوش حیات ۳-وجدان ۴-زمان۔ اقبال بھی جوش حیات کے قائل ہیں۔ انسانی زندگی میں تغیر و تبدیلی جو ایک ارتقا کی علامت ہے اس کو مانتے ہیں۔ لیکن اقبال کے ارتقائی سفر میں ایک خاص مقصد ہے اور پھر منتہائے مقصد ہے جو کہ انسانیت کی تکمیل ہے۔ نیٹشے اور برگساں کے خیالات کی جھلک علامہ اقبال کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ نیٹشے تو علامہ اقبال سے پہلے کا فلاسفر ہے برگساں اقبال کا ہم عصر ہے۔ مگر اقبال کا اندازِ فکر ان دونوں فلاسفروں سے بہت آگے ہے، اقبال کا بطور فلاسفر شہرت کا آغاز ان کی مثنوی اسرار خودی سے ہوتا ہے۔ جس میں انھوں نے خودی کے تین مراحل (۱) دستور الٰہیہ کی اطاعت (۲) ضبط نفس اور (۳) نیابت الٰہی بیان کیے۔ اقبال کا فلسفہ ارتقائی عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلے مرحلے میں خودی کی پہچان سے ترقی کے سفر کا آغاز، دوسرے مرحلے میں خودی کی پہچان سے جوش آرزو اور جستجو، تیسرے مرحلے میں یہ آرزو و جستجو زندگی میں ہیجان برپا کردیتی ہے، چوتھے مرحلے میں جب انسان تین حالتوں سے گزر جاتا ہے تو کامیابی اس کا مقدر بن جاتی ہے اور پانچویں مرحلے میں عقل کی حکومت کے بعد عشق کی حکومت ہے یہ انسانی ترقی کی انتہائی حالت ہے۔ اس میں احترامِ آدمیت اور عظمتِ انسانیت ہے۔ یہی

فلسفہ ہے جو انسانی زندگی کی رہنمائی کرتا ہے اور یہی بیانات ہیں جو ایک شاعر کو انسانی زندگی کا شاعر فلاسفر بنا دیتے ہیں۔

☆☆☆

طاہر حمید تنولی، ''علامہ اقبال کا تصورِ زمان و مکان''، پیغام آشنا، اسلام آباد، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۵-۱۳۳۔

اشیا اور واقعات کے فہم کے لیے زمان و مکان بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہر دور کے اہلِ علم و فکر نے حقیقت زمان و مکان کو سمجھنے کے لیے غور و فکر کیا۔ تاہم واقعات و اشیا کی معرفت کو پانے کے لیے زمان و مکان کے اساس ہونے کے باعث اس کی کئی جہات ضرور غور و فکر کے نتیجے میں منکشف ہوئیں۔ جدید نظریات جن میں اہم سٹرنگ تھیوری ہے نے دس سے پچیس تک جہات تجویز کی ہیں۔ اس طرح اہم تھیوری نے کائنات کی تعبیر کے لیے گیارہ جہات بیان کی ہیں۔ جن میں دس کا تعلق مکان اور ایک کا تعلق زمان سے ہے۔ تاہم یہ امر قابل ذکر ہے کہ چار سے زیادہ جہات کی موجودگی کا اطلاق صرف ذیلی اجسام کی دنیا میں ہی ہوسکتا ہے۔ زمان و مکان کا فہم بدلنے سے کائنات کے بارے میں تصور، نقطۂ نظر اور ماہیت فہم میں تبدیلی وقوع پذیر ہونے کے باعث زمان و مکان کا مسئلہ ایک بنیادی مسئلے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اقبال کے نزدیک زمان و مکان کا تعلق حیات کے ساتھ بڑا قریبی اور گہرا ہے اور جب تک اس تعلق کو نہ سمجھا جائے اس وقت تک زندگی کی حقیقت آشکار نہیں ہوسکتی۔ اقبال کے تصور زماں کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱- وجود حقیقی یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کے مقابل زمان کی حیثیت نیستی کی ہے۔ ابعاد ثلاثہ اعراض ہیں اور اعراض اپنے وجود کے لیے کسی جوہر کے محتاج ہوتے ہیں۔ جوہر قائم بالذات، واجب لذاتہٖ، موجود بوجہ ذاتی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے نہیں۔

۲- زمان کا دوسرا مفہوم جسے اقبال نے زمان مسلسل کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے جسے عرف عام میں ماضی، حال اور مستقبل کہتے ہیں، اقبال کی رائے میں غیر حقیقی ہے اور اس کا تعلق ہماری خودی کے اس پہلو سے ہے جسے اقبال نے فعال خودی سے تعبیر کیا ہے۔

۳- زمان کا تیسرا مفہوم وہ ہے جسے اقبال حقیقی زمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا تعلق ہماری قدر آفریں خودی کے ساتھ ہے۔ یہ وہ زمان ہے جو ہمارے انفس میں پوشیدہ ہے یہی دورانِ خالص ہے۔

اقبال کے تصورِ زمان کا خلاصہ یوں ہوگا: زمانِ خالص یا حقیقی زمان جس کا احساس ہمیں اپنے

شعوری تجربات کے تجزیے سے ہوتا ہے آفات کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک نامیاتی کل ہے جس میں ماضی حال سے منقطع نہیں ہوتا۔ اسی زمان خالص کو قرآن حکیم نے تقدیر سے تعبیر کیا ہے۔

تخلیق پر مبنی حرکت کا مظاہرہ زمان و مکان میں ہی ہوتا ہے۔ علامہ نے زمان کو مکان سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ وہ زمان کو مکان کا ذہن کہتے ہیں۔ اقبال اپنے تصور زمان کو شعر اور فلسفے سے گزارتے ہوئے اس اعلیٰ تصرف کے دائرے میں لے آتے ہیں جہاں خبر کی بجائے نظر، آثارِ قلم کی بجائے آثارِ قدم اور عقل محض کی بجائے ذوق و وجدان ہی رہنما اور ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران، ''اقبال اور اسلامی ثقافت کی روح''، الاقربا، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۷۰-۹۱۔

اسلامی ثقافت کے مظاہر انسان کو کائنات کی مرکزی اکائی بنا کر اعتماد کی بے پناہ دولت سے مالا مال کرتے ہوئے لاانتہا امکانات سے روشناس کراتے ہیں۔ اسلامی ثقافت کے ان داخلی محرکات کے مطالعہ کا ہمارا ماخذ اقبال کے مجموعۂ خطبات تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں شامل پانچواں خطبہ 'اسلامی ثقافت کی روح' ہے۔ اقبال نے اس خطبے میں اسلامی ثقافت پر اثرانداز ہونے اور اس کی سمت متعین کرنے والے حسب ذیل محرکات پر بحث کی ہے:

۱-شعورِ نبوت، ۲-عقیدہ ختم نبوت، ۳-سرچشمہ علم و حکمت، ۴-یونانیت کی تردید، ۵-قرآن حکیم کا تصورِ تاریخ۔

شعور نبوت میں اقبال نبی کی روحانی واردات اور ولی کی روحانی واردات کی ہیئت اور نتائج سے بحث کرتے ہوئے دونوں میں فرق واضح کرتے ہیں۔ عقیدۂ ختم نبوت کے دو نمایاں پہلو ہیں: اول یہ کہ اب انسان کو ہدایت کے لیے غیبی سرچشمے سے رہنمائی کی ضرورت نہیں، اب اسے اپنے شعورِ ذات کی تکمیل کے لیے اپنے وسائل سے کام لینا ہوگا۔ جس کے لیے باطنی مشاہدہ، مطالعہ فطرت اور تاریخ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ دوم یہ کہ اگرچہ باطنی واردات اور روحانی مشاہدات کا تجربہ اب بھی حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اب کسی کے لیے ممکن نہیں رہا کہ وہ کسی ایسی روحانی واردات کا دعویٰ کرے جس کا انکار کفر ہو۔ لہٰذا اب بھی کسی قسم کی باطنی واردات اور روحانی مشاہداتِ باطن اور ان کی نبوت جیسے مضبوط ادارے کی حیثیت سے تہذیبی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے بعد ہم اسلام کے تصورِ علم کی تہذیبی قدر و قیمت کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ یونانیت کی تردید، حیات و کائنات سے متعلق حرکی نظریات، ابن مسکویہ کا تصورِ ارتقا، عراقی کا تصورِ زمان و مکاں اور ان کے اسلامی ثقافت پر اثرات، قرآن حکیم کا تصور تاریخ، ابن خلدون کا نظریہ تاریخ، اشپنگلر کے اسلامی

تحریک وتہذیب کے متعلق غلط تصورات۔ یہ وہ چیدہ چیدہ عوامل ہیں جو اسلامی ثقافت میں کارفرما اس حقیقی روح کی ہیئت وحرکت کے ادراک میں ہماری مدد کرتے ہیں جو پیغمبر اسلامؐ کے انسانیت ساز پیغام کی پیدا کردہ ہے۔

اقبال کے نزدیک شعورِ نبوت، سرچشمہ علم وحکمت، یونانیت کی تردید وہ محرکات ہیں جو داخلی طور پر اثرانداز ہوتے ہیں۔خطبہ کے آخر میں اقبال مغربی مستشرق اشپنگلر کی اسلام کی مبادیات اور اسلامی تہذیب وثقافت سے متعلق ان غلط فہمیوں کا ذکر کرتے ہیں جن کا اظہار اس نے اپنی تصنیف زوال مغرب میں کیا ہے۔ اقبال بتاتے ہیں کہ اشپنگلر نہ تو اسلام کی ایک مذہبی تحریک کے طور پر ماہیت کو سمجھ سکا اور نہ اس نے ان عملی سرگرمیوں علیٰ ہذا فکری رویوں کو سمجھنے کی کوشش کی کہ تہذیب وتمدن کی دنیا میں جن کا آغاز اسلام کی بدولت ہوا۔ اشپنگلر کی یہ لاعلمی یا جاہلانہ تعصب مغرب کی عمومی نفسیات کی غمازی کرتا ہے۔ اقبال اس ناواقفیت یا تجاہل عارفانہ کے جملہ نفسی وعلمی محرکات سے بحث کرتے ہوئے ان حقائق کی نشان دہی کرتے ہیں جن کی دانستہ یا نادانستہ عدمِ تفہیم اشپنگلر، علیٰ ہذا مغرب کے تعصب یا غلط فہمی کا باعث بنی۔

☆☆☆